پروفیسر شاہ احمد سعید ہمدانی

سلطان باہوؒ اور اقبالؒ کا نظریۂ فقر

حضرت سلطان باہوؒ اور علامہ اقبالؒ کے نظریۂ فقر و تصوّف کا موازنہ بظاہر عجیب سی بات ہے کیونکہ دونوں میں زمانی بُعد بھی ہے اور دونوں کا تاریخی و معاشرتی پس منظر بھی جُدا جُدا ہے۔ اس کے باوجود دونوں بعض معاملات میں ایک سی بات کہہ رہے ہیں تو یہ محض حُسنِ اتفاق ہے۔ ان کے بیان و کلام میں بہت سے تہذیبی و ثقافتی منابع بے شک مشترک ہوں گے لیکن اپنے اپنے دَور کے مطابق دونوں کے ذاتی واردات و تاثرات کے ماخذ مختلف ہی نظر آتے ہیں۔

سلطان باہوؒ نے اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں پنجاب کے ایک قصبہ شورکوٹ میں بیٹھ کر تلقین و ارشاد کا کام شروع کیا۔ پنجابی و فارسی میں اشعار کہے اور فارسی نثر میں سلوک و تصوّف سے متعلق رسائل لکھے۔ یہ اُس دَور میں اُن کی بہت بڑی علمی و معاشرتی خدمت تھی۔ وہ اونچے روحانی مقامات پر فائز ہونے کے باوجود اَن پڑھ دیہاتیوں میں رہے اور انھیں مذہب و روحانیت کا درس دیا۔ اُن کا مقصد وہی تھا جو دوسرے صوفیا کے پیشِ نظر رہا۔ یعنی لوگوں کا تزکیۂ اخلاق، تصفیۂ باطن اور مراتبِ روحانی کے حصول کے لیے ان کی خاص انداز میں رہنمائی۔

علامہ اقبال نے بیسویں صدی کے اوائل میں پنجاب کے ثقافتی مرکز لاہور میں قیام پذیر ہو کر تمام عالمِ اسلام کو اپنا ہدفِ خطاب قرار دیا اور اردو و فارسی شاعری کے ذریعے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے ذہنی فضا تیار کرنے کی کوشش کی۔ اور افرادِ ملت کو اس امر کا احساس دلانے کے لیے اپنی علمی بصیرت اور ذہنی رفعت سے کام لیا۔ جب تک وہ زندہ رہے مسلمانوں کو صحیح معنوں میں مومن بننے کی تلقین کرتے رہے۔

تصوّف کے موضوع پر ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن ہر صوفی اپنے رنگِ طبیعت اور اسلوبِ بیان کے ساتھ یا تو نئے انداز میں کچھ باتیں کہتا ہے۔ یا پھر اپنے دَور کے کچھ مخصوص مسائل

کو پیش نظر رکھ کر چند امور پر زیادہ زور دیتا ہے۔ اس طرح وہ دوسروں سے الگ اپنی ایک منفرد حیثیت بنا لیتا ہے۔ سلطان باہوؒ اور علامہ اقبالؒ دونوں عارفین و صوفیا کی طرح سلوک کے احوال و مقامات کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن دونوں اپنے اپنے دائرے میں منفرد اور نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کے نظریات و افکار کے موازنہ کی صورت یہ نہیں ہے کہ دونوں ایک سے حالات میں تبلیغ و ارشاد کے کام میں مصروف رہے ہوں یا دونوں کے موضوعاتِ فکر ہو بہو ایک جیسے ہوں بلکہ دونوں کے ہاں زمانہ یا رنگِ طبیعت کے اقتضا کی بنا پر موضوعات کا انتخاب و اہتمام مختلف ہے۔ ان میں اشتراکِ فکر و تصوف صرف یہ ہے کہ بعض امور میں دونوں ایک سا انہماک ظاہر کرتے نظر آتے ہیں۔ حضرت سلطان باہوؒ کے ہاں چند ایسے امور کی تاکید و تکرار ملتی ہے جس کی وجہ سے علامہ اقبالؒ کے پیغام کی بعض باتوں میں ان کی مماثلت پیدا ہو گئی ہے۔

سلطان باہوؒ طریقِ قادریہ کے پیرو تھے۔ چنانچہ اپنے رسائل میں وہ اس کی برتری و افادیت کا اظہار کر کے سالکین کو اس کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بار بار اس کی تعریف کرتے ہیں:

"دوسرے طریقے بمنزلہ چراغ ہیں اور طریقہ قادریہ بمنزلہ آفتاب ہے۔" (عقلِ بیدار)

"طریقہ قادری میں معرفتِ الٰہی کے خزینے ہیں۔ اس مقام والا ریاضت و مشقت سے گھبرا کر رنجیدہ خاطر نہیں ہوتا۔ جو کچھ اس کے سامنے آتا ہے، خدا کی راہ میں خرچ کر دیتا ہے۔" (گنج الاسرار)

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے بارے میں کہتے ہیں:

"اصلِ جیلانی ز باطن مصطفےٰ   ایں مراتب قادری قدرت الٰہ

شو مرید از جان باہو بالیقین   خاک پائے شاہ میراں مائیں دیں" (گنج الاسرار)

علامہ اقبال کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بھی طریقہ قادری کے کسی بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ مگر یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکی اور نہ یہ معلوم ہو سکا ہے کہ اگر یہ بات صحیح ہے تو وہ بزرگ کون تھے اور اقبال نے کس حد تک ان سے اکتسابِ فیضِ روحانی کیا تھا۔ جہاں تک ان کی شعری و نثری تصانیف کا تعلق ہے ان میں اس کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ اگر

یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ جاتے تو سلطان باہوؒ اور اقبالؒ کے درمیان سلوک و تصوف میں ایک اور آپس کے قریبی رشتہ کا پہلو نکل آئے گا۔

علامہ اقبال تصوف کے لیے اپنی شاعری میں فقر و قلندری کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ جیسے:

فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضا ست

فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ

اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری

فقر را از کف مدہ، از کف مدہ

اب ترا دور بھی آنے کو ہے اے فقرِ غیور

اس سے پہلے سلطان باہو نے بھی تصوف و سلوک کے مقامات کی تشریح و توضیح کے بیان میں فقر کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ ان تمام نثری تصانیف کا موضوع فقر ہے۔ جا بجا وہ فقر کی تعریف میں رطب اللسان ہیں:

"فقر سرّ اللہ ہے اور اللہ سرّ فقر، فقیر انسان ہے اور باقی لوگ حیوان ہیں۔" (عین الفقر)

"ہر چیز کی کسوٹی ہوا کرتی ہے۔ سو علم کی کسوٹی فقر ہے۔" (جامع الاسرار)

اپنے پنجابی ابیات میں کہتے ہیں:

"ایتھے اوتھے دوہیں جہانیں سب فقر دیاں جائیں ہوُ"

(دونو جہان فقر کے لیے ہیں)

"نام فقیر تنہاں دا باہوُ جیہڑا دم دم دوست سمھالے ہوُ"

(باہوُ فقیر اسے کہتے ہیں جو ہر لحہ دوست کو یاد رکھے)

"نہیں فقیری جلیاں مارن ستیاں لوگ جگاون ہُو
نہیں فقیری دھندیاں ندیاں سکیاں پار لنگاون ہُو
نہیں فقیری وچ ہوا دے مصلے پا ٹھراون ہُو
فقیری نام تنھاں دا باہو، دل وچ دوست ٹھراون ہُو"

(نعرے مار کر سوتوں کو جگانا، بہتی ندیوں کو اس طرح عبور کر لینا کہ بدن خشک رہے اور ہوا میں مصلے بچھا دینا فقیری نہیں ہے۔ باہُو دل میں دوست کی یاد کا نام فقیری ہے)

اقبال نے ایسے فقر کی جو خلق سے علیحدگی اور رہبانیت کی تعلیم دیتا ہو، مخالفت کی ہے۔ کیونکہ یہ غیر اسلامی طریق ہے۔ مسلمانوں میں اکابر صوفیا کا طریق یہ رہا ہے کہ وہ جمعیتِ قلبی اور زہد و عبادت کی خاطر کچھ عرصہ کے لیے تنہائی میں وقت ضرور گزارتے تھے، مگر خلقِ خدا سے کلی علیحدگی ان میں سے کسی نے اختیار نہیں کی۔ سلوک کی منزلیں طے کرنے کے بعد رُشد و ہدایت کے لیے وہ ہمیشہ خلق کی طرف رجوع کرتے رہے۔ اسلامی فقر اور رہبانیت کے بارے میں اقبال کے مشہور اشعار ہیں:

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری — اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری — اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری
اک فقر ہے شبیری، اس فقر میں ہے میری — میراثِ مسلمانی، سرمایۂ شبیری

میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا — تمھارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری

کچھ اور چیز ہے شاید تری مسلمانی — تری نگاہ میں ہے ایک فقر و رہبانی
سکوں پرستیٔ راہب سے فقر ہے بیزار — فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی

سلطان باہوؒ بھی ایسے تصوف کے خلاف ہیں، جو انسان کو خلقت سے الگ کر دے اور ذلت و خواری کی طرف لے جائے۔ اسے وہ حدیث کی رُو سے فقر المُکِب (منہ کے بل گرنے والا فقر) کہتے ہیں۔ اور اپنے مخصوص انداز میں سمجھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

" فقر اضطراری میں ف سے فضیحت، ق سے قہرِ خدا اور ر سے رَد حاصل ہوتا ہے۔" (رسالہ اورنگ شاہی)

فقیر مخلوق سے الگ نہیں رہ سکتا۔ انسانوں کے درمیان رہ کر ہی وہ اپنا فرض سرانجام دے سکتا ہے:

" فقیر خود تو ناسوت (دنیا) میں رہے۔ لیکن طالبوں کو لاہوت (روحانی عالم) کے حضور میں پہنچا دے۔" (ایضاً)

" صد آفرین ہو اُس شخص پر کہ دن کو خلق اللہ کے ساتھ عدل و انصاف کرکے ظلّ اللہ اور شب کو اپنے نفس کا محاسبہ کر کے ولی اللہ بنتا ہے۔" (مجالسۃ النبی)

" صاحب ولایت ایک دم بھی خلقِ خدا کی محافظت سے غافل نہیں ہوتا۔ وہ آفتاب کی طرح ہر ایک کو یکساں فیض پہنچاتا ہے اور ہر ایک کی رہنمائی کرتا ہے۔" (عقلِ بیدار)

اگرچہ اقبال ملّت کے اجتماعی مسائل کے لیے مسلمانوں کو کارِ جہاں میں عملی حصہ لینے کی ترغیب دیتے ہیں، مگر ساتھ ہی قوم کو دولتِ دنیا سے بے نیازی اور اقدارِ غیرت وخودداری کی پاسداری کی بھی تلقین کرتے ہیں۔ حرص و آز سے " طائرِ لاہوتی " کی پرواز میں کمی آجاتی ہے اور دولت سے محبت کی وجہ سے قوموں کی بہترین صلاحیتیں تعیش کی نذر ہو جاتی ہیں اس لیے وہ اپنے نظامِ فقر میں استغنا اور غیرت وخودداری کا بار بار ذکر کرتے ہیں:

خدا کے پاک بندوں کو، حکومت میں، غلامی میں،
زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا!

در آ بسجدہ و یاری زخسرواں مَطلَب ۔۔۔ کہ روزِ فقر نیاگانِ ما چنیں کردند

خواجۂ ما نگاہ دار آبروئے گدائے خویش ۔۔۔ آنکہ زجوئے دیگراں پُر نکند پیالہ را

استغنا میں انھیں مسلمانی کی معراج نظر آتی ہے۔ اسی کو قدیم صوفیا اپنی اصطلاح میں " ترکِ دنیا " سے تعبیر کرتے ہیں۔ ممکن ہے ترکِ دنیا کا مفہوم کبھی غلط بھی سمجھا گیا ہو یعنی

دنیا اور دنیا والوں سے مکمل علیحدگی و مفارقت، مگر اکابر صوفیا کے ہاں ترکِ دنیا کا مفہوم صرف اسی قدر تھا کہ مردِ راہ، دولت کی کثرت اور اس کی حرص سے نجات حاصل کر کے استغنا اور بے نیازی کے ساتھ زندگی بسر کرے۔ کیونکہ بقول اقبال:

اے بسا مردِ حق اندیش و بصیر — می شود از کثرتِ نعمت ضریر
کثرتِ نعمت گداز از دل بُرد — نازمی آرد نیاز از دل بُرد

حضرت سلطان باہوؒ نے "ترکِ دنیا" پر بہت زور دیا ہے اور اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ دولت و نعمتِ دنیا کی خواہش بالکل ختم کر دینی چاہیے۔ وہ لوگ جو دولت کے طفیل تعیش کی زندگی بسر کرتے ہیں، حیوانوں کی سطح پر زندہ ہیں۔ کہتے ہیں:

نعمت بہ خراں دادند و دولت بہ سگاں — ما امن اما نیم تماشا نگراں!

"فقیر درویش اسے کہتے ہیں کہ اگر اُسے روئے زمین کا سارا مال و متاع بھی دے دیا جائے تو اسی وقت راہِ خدا میں صرف کر دے۔ جیسا کہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔" (نور الہدیٰ)

فقر و استغنا، ذوق و شوق اور تسلیم و رضا کی خصوصیات انسانِ کامل کی ذات میں مکمل صورت میں نظر آتی ہیں۔ "اقبال۔ نئی تشکیل" میں عزیز احمد نے اس بارے میں لکھا ہے:

"انسان کامل کے لیے اقبال نے نظم و نثر میں بہت سی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ خلیفۃ اللہ فی الارض، مردِ تمام، مردِ مومن، درویش، فقیر، قلندر، ان سب اصطلاحات میں ممکن ہے کہ معنوی طور پر بہت ہی خفا سا فرق ہو۔ مگر ان سب سے انسان کامل ہی مراد ہے اور اس کی خصوصیات ان سب میں موجود ہیں۔"

اقبال کے تمام شارحین اس پر متفق ہیں کہ اقبال انسان کامل کے تصور کے سلسلے میں مغربی مفکرین کی بجائے صوفی مفکر عبدالکریم الجیلیؒ سے متاثر ہوئے۔ علامہ اقبال فلسفۂ عجم کی تصنیف کے دوران میں ہی الجیلی کے انسان کامل کے تصور سے آشنا ہو چکے تھے۔ عزیز احمد کہتے ہیں:

"عبدالکریم الجیلی کے انسانِ کامل کا راستہ الٰہیات اور مابعد الطبیعیات میں بہت الجھا

ہوا ہے۔ مگر انسانِ کامل کے کسی اور واحد نظریے کا اقبال کے درویش اور مومن کے تصور پر اتنا اثر نہیں پڑا جتنا کہ جیلیؒ کے بعض خیالات کا اثر ہے۔"

البتہ الجیلیؒ انسانِ کامل کے درجے تک پہنچنے کا رستہ وہی بتاتے ہیں جو صوفی مفکرین نے اپنے اپنے طریقوں کے سلوک میں متفقہ طور پر بیان کیا ہے یعنی ذکر و فکر، مراقبہ، استغراق، مراتب روحانی کی طرف صعود اور بالآخر وجودِ مطلق سے اتحاد۔ اقبال اپنے مخصوص نظریۂ خودی کی روشنی میں مومن کے لیے تین مرحلے تربیت کے سلسلے میں تجویز کرتے ہیں۔ اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی۔ جب انسان نیابتِ الٰہی کے منصب پر فائز ہوتا ہے، تو وہ زمانے کا راکب بن جاتا ہے۔ مرکب نہیں ہوتا۔ عزیز احمد کے الفاظ میں اقبال کا انسانِ کامل" وہ آدمی ہے جو ملک دین کے لیے مردِ راہ ہے۔ اسے بصارت اور بصیرت دونوں نصیب ہیں۔ اس کے روئیں روئیں سے آفتاب کے پھوٹتے ہوئے نور کی طرح نگاہیں پیدا ہوتی ہیں":

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دلِ بے نیاز
نقطۂ پرکارِ حق، مردِ خدا کا یقیں اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

ہر کہ در آفاق گردد بوتراب باز گرداند ز مغرب آفتاب

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اَولیٰ ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

دراصل یہ وہی مقام ہے جسے صوفیا ولایت کا مقام کہتے ہیں۔ ڈاکٹر میر ولی الدین اپنے مقالہ "فلسفۂ خودی" میں لکھتے ہیں:

"عبداللہ ولی اللہ ہے۔ ولایت کی شان کو اقبال بڑی وضاحت سے بیان کرتے ہیں؛

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی — ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشاں
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن — قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے — دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز — آہنگ میں یکتا، صفتِ سورۂ رحمٰن

عبد ہو کر بھی وہ امین اللہ، خلیفۃ اللہ اور ولی اللہ ہوتا ہے۔ ایسا عبد کہہ سکتا ہے اَنَا عَبْدُكَ کیونکہ وہ معلوم اللہ، مخلوق اللہ، غیر ذات اللہ ہے اور پھر وہ یہ بھی کہہ سکتا ہے: مَنْ رَآنِي فَقَدْ رَأَى الْحَقَّ۔ کیونکہ اس میں ہُویت و انیت حق ہی کی ہے۔ وجود و خودی حق ہی کی ہے۔"

سلطان باہوؒ کو بھی تصورِ انسانِ کامل کا موضوع پسند ہے۔ یوں تو تمام صوفیا، مرشد یا شیخ، طریقت کی تعریف میں عموماً بہت سی خوبیاں بیان کرتے ہی ہیں۔ مگر سلطان باہوؒ کے آثار نظم و نثر میں حیرت انگیز طور پر انسانِ کامل کے تصور کی تکرار ملتی ہے۔ شاید ہی ان کا کوئی رسالہ یا کتاب ہو جس میں انھوں نے اس کا ذکر نہ کیا ہو۔ وہ انسانِ کامل کے لیے "فقیر، فقیرِ کامل، مرشدِ کامل، عارف، معارف، سلطان التارکین، سلطان العارفین، درویش، مالک الملکی" وغیرہ کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ کمالیت کے اس درجہ تک پہنچنے کے لیے سلطان باہوؒ نے الجیلیؒ کے سلوک یا قواعد و ضوابطِ روحانی کی تائید کی ہے، جیسا کہ خود علامہ اقبالؒ نے الجیلیؒ کے انسانِ کامل کی ارتقائی منازل کی وضاحت کی ہے۔ پہلی منزل ذکر اسمِ الٰہی اور اس میں استغراق و انہماک ہے کیونکہ "اسم مسمّٰی کو ہمارے فہم میں جما دیتا ہے۔ ذہن میں اس کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ تخیل میں اس کو مستحضر کرتا ہے۔ اسم ایک آئینہ ہے جو ہستیٔ مطلق کے تمام اسرار کو منکشف کر دیتا ہے۔ یہ ایک روشنی ہے، جس کے ذریعہ خدا اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔" (فلسفۂ عجم) دیگر منازلِ صعودِ روحانی اور بالآخر وجودِ مطلق سے اتحاد وغیرہ ہیں۔

سلطان باہوؒ کہتے ہیں :

"واضح رہے کہ ہر ایک مقام کی ابتدا و انتہا ظاہر و پوشیدہ تمام مخلوقات اسم اللہ ذات کی طی میں ہے"۔ (اسرار قادری)

"عزیز من! انسان اس وقت تک ذاکر نہیں کہلا سکتا جب تک ذکر کی چابی اس کے ہاتھ میں نہ ہو۔ ذکر کی چابی اسم اللہ ذات کا تصور ہے"۔ (کلید جنت)

اسم اللہ بس گراں است بے بہا　　اسم اللہ را بداند مصطفیٰؐ

کنہ اللہ را محمدؐ یافتہ　　جاں بہ اسم اللہ تاختہ (فضل اللقاء)

چناں کن اسم را در جسم پنہاں　　کہ گردد الف در بسم پنہاں (محکم الفقرا)

ہر چہ خوانی اسم اللہ را بخواں　　اسم اللہ با تو ماند جاوداں (کلید جنت)

ذکر و فکر اور مراقبات سے وہ اپنی روحانی طاقت بڑھاتا ہے۔ مراقبہ کے بارے میں وہ کہتے ہیں ؛

"مراقبہ مثلِ آفتاب ہے۔ جب آفتاب طلوع ہوتا ہے تو قاف سے قاف تک ، مشرق سے مغرب تک روشن ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مراقبے والے کی نظر وسیع ہو جاتی ہے۔ اور در و دیوار، شہر و بازار تمام چیزیں اس کے پیشِ نظر ہوتی ہیں بلکہ تماشائے شش جہات اس کے روبرو ہوتا ہے"۔ (عین الفقر)

ایک فرق یہاں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ الجیلیؒ اور سلطان باہوؒ انسانِ کامل کے اخلاقی و روحانی ارتقا میں باطن کو اہمیت دیتے ہیں اور علامہ اقبالؒ نے خارج پر بھی نظر رکھی ہے۔ اسی طرح داخل و خارج کا انھوں نے توازن قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ الجیلیؒ اور سلطان باہوؒ کا فقیرِ کامل، عالمِ خلق سے عالمِ امر کی طرف سفر کرتا ہوا احدیت تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ اور "فنا فی اللہ، بقا باللہ" کا مرتبہ حاصل کر لیتا ہے۔ یہی ولایت کا مقام ہے۔ فقیر یہاں پہنچ کر مقلب القلوب ہو جاتا ہے :

"فقیر وہ ہے جو لامکان میں ہو اور دلوں کو جس طرف چاہے پھیرا سکے"۔ (جامع الاسرار)

"اگر فقیرِ کامل جاہل کی طرف نگاہ کرے تو اُسے علمِ لدُنّی اس قسم کا حاصل ہوتا ہے کہ تمام جہان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور دو تین قدموں میں ہی ساری زمین طے کر لیتا ہے۔" (ایضاً)

علامہ اقبالؒ نے بھی یہی کہا ہے :

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

پھر سلطان باہوؒ لکھتے ہیں :

"فقیر آفتاب کی طرح فیض بخش ہوتا ہے۔" (محبت الاسرار)

"فقیر بمنزلۂ سمندر اور اس کی نظر بمنزلۂ سونی ہے۔" (محکم الفقراء)

پنجابی ابیات میں لکھتے ہیں :

لا یحتاج جھناں نوں ہویا فقر تنھاں نوں سارا ہُو
نظر جھناں دی کیمیا ہوئی اوہ کیوں مارن پارا ہُو

(جو لا یحتاج ہو جاتے ہیں۔ سب فقر ان کے لیے ہے جن کی نظر کیمیا اثر ہو جائے انھیں سونا بنانے کے لیئے پارہ مارنے کی کیا ضرورت ہے؟)

نام فقیر تنھاندا باہو جو گھر بیٹھا یار دکھاوے ہُو

(فقیر وہ ہے جو گھر بیٹھے محبوب کا دیدار کرا دے)

ثابت صدق تے قدم اگیرے تائیں رب لبھیوے ہُو لُوں لُوں دے وچ ذکر اللہ دا ہر دم پیا پڑھیوے ہُو
ظاہر باطن عین عیانی ہُو ہُو پیا سنیوے ہُو۔ نام فقیر تنھاندا باہو قبر جنھاندی جیوے ہُو

(جب صدق اور استقلال کے ساتھ فقیر کا قدم آگے بڑھتا ہے تو وہ رب کو پالیتا ہے۔ اس کے ہر روئیں میں ذکر الٰہی جاری رہتا ہے اور ظاہر و باطن میں ھُو ھُو کی آواز سنائی دیتی ہے۔ باہوؒ فقیر اس کو کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی جس کی قبر زندہ رہے یعنی لوگوں کو اس کا فیض برابر پہنچتا ہے۔

گو سلطان باہوؒ اور علامہ اقبالؒ کے نظریۂ فقر میں بعض موضوعات مشترک ہیں جیسے اصطلاح فقر، استغنا کی اہمیت اور فقیرِ کامل یا انسانِ کامل کا تصور، مگر ان تمام مماثلتوں کے تجسس و دریافت کے باوجود یہ اعتراف پھر دہرانا چاہیے کہ یہ موازنہ تحقیقی نہیں، محض ذوقی معاملہ ہے۔